انٹرویو : حافظ عبدالرحمن مدنی — ترتیب :- میاں شعیب الرحمٰن

نظام حکومت اور خلافت راشدہ

(جولائی، اگست ۱۹۸۱ء)

سطور ذیل میں محدث کے مدیر اعلیٰ حافظ عبدالرحمن مدنی کا " اسلام کے سیاسی تصور " کے موضوع پر وہ انٹرویو دیا جارہا ہے جو نمائندہ ہفت روزہ "بادبان" لاہور میاں شعیب الرحمٰن صاحب نے حافظ صاحب موصوف سے کیا۔ کتابت کی بعض اہم غلطیوں اور آخری دو صفحات میں عبارت کی غلط جڑائی نے اسے ناقص بنا دیا تھا۔ قارئین اسے صحیح صورت میں ملاحظہ کریں۔ (ادارہ)

لانبے قد، سیاہ داڑھی اور عالمانہ وجاہت رکھنے والے حافظ عبدالرحمٰن مدنی، سکونت کے لحاظ سے تو پنجابی ہیں، مگر سوچ، خیالات اور احساسات اور دل و دماغ کے اعتبار سے واقعی مدنی ہیں۔ اپنے نام کے لاحقے "مدنی" کی رعایت سے ان پر ایک ہی خواہش، ایک ہی امنگ، ایک ہی تمنا اور ایک ہی دھن سوار رہتی ہے کہ کل قیامت کے روز مدینے والے کے سامنے سرخرو رہیں۔ بس یہی سوچ، یہی خواہش ان کی روح کو مضطرب، قلب کو بے قرار اور آنکھ کو بیدار رکھتی ہے۔

برصغیر کے معروف علمی خانوادے "روپڑی خاندان" کے اس چشم و چراغ نے جسے دنیاوی کاروبار کی تمام سہولتیں حاصل تھیں اور ہیں، اپنے لئے علم دین کے میدان کو منتخب کیا۔ لیکن قدرت نے ان پر معیشت کی راہیں یوں کشادہ کیں کہ ان کے چھوٹے بھائی لاہور ہی میں لوہے کا بہت بڑا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کھانے کمانے کے ذرائع اچھے اور تمام

سہولتیں بہ آسانی میسر ہوں تو آدمی کا ذاتی اخلاق، دینی حمیت، مروت، ہمدردی اور رواداری خطرے کی زد میں آجاتی ہے۔ ان تمام صفات پر ہمہ وقت حرص و ہوس اور غرور و تکبر کی پرچھائیں پڑتی رہتی ہیں۔ لیکن حافظ صاحب کو اللہ نے یہاں بھی محفوظ رکھا بے شک جو رب کو یاد رکھتے ہیں ان کا رب بھی انہیں کبھی نہیں بھلاتا۔ حافظ صاحب ہر آنے والے سے تواضع فرماتے عاجزی برتتے اور انکساری سے ملتے ہیں۔ اپنے زیر اہتمام چلنے والے تینوں اداروں کے اساتذہ طلبار اور ملازمین سے بڑی شفقت سے پیش آتے اور محبت کرتے ہیں۔

ماڈل ٹاؤن لاہور کے "جے" بلاک کی کوٹھی نمبر ۹۹ ان کی دینی و تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ مجلس التحقیق الاسلامی (جس سے بحث و تحقیق اور تعلیم و تدریس کے ادارے مربوط ہیں) کا ہیڈ کوارٹر اور نادر کتابوں پر مشتمل ایک وسیع الشان لائبریری بھی اسی عمارت میں ہے۔ میں حافظ صاحب سے ملاقات کے لئے ان کی رہائش پر پہنچا۔ انٹرویو کی بات کی تو جواب ملا "میں کیا اور میرا انٹرویو کیا؟ ہم لوگ تو ملت کی عمارت میں اینٹ، گارے کی چنائی کا کام کر رہے ہیں۔" تصویر کے لئے کہا تو کنی کترا گئے، اصرار کیا تو مسکرا کر طرح دے گئے۔ "میں تصویر نہیں کھنچواتا کہ میں اسے جائز نہیں سمجھتا۔" میرا اصرار بڑھا "صرف آج کھنچوا لیجئے۔" "نہیں آج کھنچوالی تو پھر گناہ کا حوصلہ ہو جائے گا" پھر میری نظر میں دو سال قبل کا واقعہ گھومنے لگا۔ جب مجلس تحقیق الاسلامی نے دو روزہ قانون و شریعت کنونشن کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں جلالۃ الملک شاہ خالد کے مشیر ڈاکٹر معروف الدوالیبی بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت بھی حافظ صاحب نے جو اس تقریب کے میزبان تھے کیمرے کے سامنے آتے ہی کتاب سے منہ ڈھانپ لیا تھا۔

حافظ صاحب سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی تو تین گھنٹے لمحے بن کر اڑ گئے ان سے ہمارا پہلا سوال تھا:۔

شعیب الرحمٰن: یہ سیاست کا لفظ جس نے بڑے بڑے گل کھلائے ہیں، کہاں سے آیا اور اسلام میں سیاست کا کیا تصور ہے؟

حافظ صاحب: اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے سیاست کا مفہوم اچھا ہے۔ اور اسلام میں کوئی دین و سیاست کی تقسیم بھی نہیں۔ عربی زبان میں "ساسس" گھوڑوں کو سدھانے اور دیکھ بھال کرنے والے کو کہتے ہیں یہ لفظ ہم اردو، فارسی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ سیاست کا معنی تدبیر کرنا اور سدھانا ہے۔ ساسس اس کا اسم فاعل ہے اسلام میں کسی

معاشرہ کو منظم بنانے اور اعلیٰ مقاصد پر گامزن کرنے کے طور طریقوں کا نام سیاست ہے۔ لیکن موجودہ علمِ سیاست کی رو سے سیاست میں اصل مقصود اقتدار رہ گیا ہے کیونکہ سیاست دان یا سیاسی جماعتیں اسی لیے وجود میں آتی ہیں کہ مخصوص مقاصد کے لیے اقتدار حاصل کریں۔ آج کل عملی سیاست میں بیشتر مقاصد نظر انداز ہو جاتے ہیں اور اقتدار سامنے رہتا ہے۔ حالانکہ اسلام کے سیاسی تصور میں اصل چیز اطاعت اور اس کی تدبیر ہے۔ قرآن کریم میں اس تصور کی تفصیلات موجود ہیں کہ انسان کا مقصدِ حیات زندگی کے ہر شعبے میں اطاعت و عبادتِ الٰہی ہے کیونکہ اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور سب اسے ماننے پر مجبور ہیں۔ اس لیے وہ موضوعِ بحث ہی نہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے۔ وله من فی السموات والارض کُلٌّ له قانتون "آسمانوں اور زمینوں کے باسی اسی کے ہیں۔ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:۔ وله اسلم من فی السموات والارض طوعًا وکرهًا سب صاحبِ عقل و نطق مخلوق (جن انسان اور فرشتے) آسمانوں اور زمین میں اسی کے تابع فرمان ہیں خوشی سے اور مجبوری سے" ہماری موجودہ سیاست کی اصطلاح میں حاکمیت " اقتدارِ اعلیٰ کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن اسلام کی رو سے اقتدارِ اعلیٰ کا اللہ کے لیے ہونا مسلمہ چیز ہے۔ قرآن کریم میں حاکمیت اقتدار کے معنی میں بھی استعمال ہوئی ہے اور اطاعت کے معنی میں بھی جہاں اقتدار کے معنی میں استعمال ہوئی ہے وہاں اللہ کے سوا سب کو بے بس بتایا ہے۔

سورۂ یوسف میں ہے "لاتدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقة وما اغنی عنکم من الله من شیءٍ ان الحکم الا لله۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو مصر بھیجتے وقت یہ نصیحت کی کہ تم سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا اگرچہ میری یہ تدبیر تمہیں اللہ کی تقدیر سے کچھ بھی کفایت نہیں کرتی کیونکہ قوت اور فیصلہ صرف اسی کے ہاتھ میں ہے!

دیکھئے تدبیر بتانے کے باوجود تقدیر کے سامنے بے بسی کا اظہار کیا ہے۔

اسی سورۂ یوسف میں ہی ایک دوسرے مقام پر حکم اور حاکمیت کو اطاعت کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ان الحکم الا لله امر الا تعبدوا الا ایاه

اطاعت صرف اللہ کی ہے اس نے حکم دیا ہے کہ اسی کے بن کر رہو!

چونکہ یہاں "حکم" اطاعت کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس لیے اطاعت کی کامل شکل عبادت کا امر بھی دیا ہے لیکن اول الذکر آیت میں حاکمیت کو بطور فیصلہ اور قوت کے ذکر فرمایا ہے اور اس کے سامنے اپنی مجبوری بھی پیش کی۔ حاصل یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ تو اللہ کے لیے ہے ہی اس لیے اطاعت صرف اسی کی ہونی چاہیے۔ اسی کی اطاعت کروانے کے لیے انبیاء دنیا میں تشریف لاتے رہے اور لوگوں سے اس پر بیعت لیتے رہے۔ اطاعت کے لیے قرآنی اصطلاح "دین" ہے جو عقیدہ و عمل یا موجودہ اصطلاحات میں "نظریہ" اور "نظام" پر مشتمل ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔ "وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین" لوگ اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیئے گئے ہیں کہ اطاعت کو اس کے لیے خالص کریں۔ اسلام کا سیاسی فکر لوگوں کو (دین) اطاعت الٰہی کے لیے تیار کرنا ہے۔

شعیب الرحمٰن:۔ حافظ صاحب آپ نے اسلام کے سیاسی نظریہ کے طور پر اطاعت کو پیش کیا ہے مروجہ نظاموں کے تقابل سے اسلامی نظامِ حکومت پر بھی روشنی ڈالیے۔

حافظ صاحب:۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسان اطاعت و عبادت الٰہی کا مکلف ہے اسی لیے اسے خیر و شر کے چناؤ کا اختیار دیا گیا ہے جب کہ ملوکیت، آمریت اور جمہوریت میں انسان فردِ واحد، پارٹی اور عوام کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے گویا ہمارے وضع کردہ نظاموں میں اقتدارِ اعلیٰ فرد یا جماعت کو سونپا جاتا ہے اور انہی کی اطاعت کے لیے اسے مجبور کیا جاتا ہے۔ دراصل ہمارے سب نظام انسانی غلامی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ملوکیت اور آمریت کے خلاف پروپیگنڈے نے ہمیں دلیل سے بے نیاز کر دیا ہے لیکن جمہوریت کو انسانی آزادی کے شعار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ جمہوریت ایسا جبر ہے جس کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھائی جا سکتی بقول ڈاکٹر اقبال ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مغرب نے مسلمانوں کے جہاد کو بدنام کرنے کے لیے مذہبی جبر کا بڑا پروپیگنڈہ کیا ہے لیکن اسلام میں جہاد کا تصور ہی انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور ظلم و ستم سے نجات دلانا ہے۔ جنگِ قادسیہ کے موقعہ پر سعد بن ابی وقاصؓ کے نمائندہ، ربعی بن عامرؓ کے الفاظ اس کی اچھی مثال ہیں مسلمانوں

کی جنگجوئی کے متعلق رستم کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانے اور ان کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے نکلے ہیں۔

شعیب الرحمٰن:۔ اسلامی جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات حکومت سوسائٹی کو سونپ دیئے ہیں یعنی اصل اختیار و اقتدار تو اللہ ہی کا ہے انسانوں کو یہ اختیار خدا کا تفویض کردہ ہے۔ اس وضاحت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

حافظ صاحب:۔ دراصل یہ توجیہہ دُنیا میں انسان کے خلیفۃ الٰہی ہونے کے تصور سے پیدا ہوئی ہے حالانکہ یہ تصور ہمارے اسلاف میں بہت ناپسند کیا گیا ہے امام ابن تیمیہؒ تو ایسا عقیدہ رکھنے والے کو کافر اور مُشرک کہتے ہیں۔ من اعتقد ان الانسان خلیفۃ اللہ فقد کفر۔ علامہ ماوردی احکام السلطانیہ میں جمہور علماء سے ایسے شخص کے بارے میں فاسق و فاجر ہونے کی رائے نقل کرتے ہیں کیونکہ اگر انسان کو خدا کا خلیفہ بنا کر وہی اختیار و اقتدار اسے تفویض کر دیا جائے تو انسان خود مطاع بن جاتا ہے خواہ اختیار مفوضہ کا حامل ہی کیوں نہ ہو حالانکہ عام انسان تو کسی بھی مطاع مطلق اللہ جل شانہ کی اطاعت کرانے کے لیے آتا ہے۔ اسی حیثیت سے وہ اللہ کا نمائندہ "رسول" ہوتا ہے، خلیفہ نہیں۔ اگر "نائب" اور "نمائندے" کے فرق پر غور کر لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا یہ فرمان اسلامی فکر کی اچھی تعبیر ہے کسی نے آپ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے جواب دیا۔

"لست خلیفۃ اللہ بل انا خلیفۃ رسول اللہ"۔

میں اللہ کا خلیفہ نہیں۔ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔

جدید علم سیاست کی رُو سے بھی حاکمیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی کو تفویض نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حکمران اپنے قول و فعل کی یہ حیثیت مقرر کر دے کہ اس پر کوئی فرد یا ادارہ نظر ثانی نہ کر سکے تو گویا اُس نے خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ کیونکہ بالاتر ہونا اللہ کی صفت ہے۔ قرآن کریم میں ہے: "لا یُسئل عما یفعل وھم یُسئلون" اللہ تعالیٰ کو کسی فعل پر باز پرس نہیں جب کہ باقی سب کا محاسبہ ہوگا۔ یہی چیز اسلام کو ملوکیت یا آمریت سے ممتاز کرتی ہے۔

شعیب الرحمٰن: کیا قرآن مجید میں انسان کو اللہ کا خلیفہ نہیں کہا گیا؟ آپ "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" کا کیا جواب دیں گے؟

فکر پیش کیا تھا جو بعد میں بعض دیگر علماء نے بھی اختیار کر لیا حالانکہ کتاب و سنت میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نسبت سے خلیفہ نہیں کہا۔ اس آیت میں بھی خلیفہ کی اضافت اللہ کی طرف نہیں بلکہ یہ جنس آدم کی ایک صفت ہے کہ نوع بنی آدم میں خلافت کا نظام قائم ہوگا اگر ایک قوم خلافتِ ارضی کے مقام پر فائز ہو پھر نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر اللہ کی حجت پوری ہو کر دوسری قوم ان کی جگہ آبسے تو گویا وہ پہلی کی خلیفہ بنی یعنی خلافت ارضی بنی نوع انسان کا ایک باہمی نظام ہے جو یکے بعد دیگرے زمین پر آباد ہو کر اللہ کی نعمتوں سے فیضیابی کی صورت میں حاصل ہوتا ہے اور نافرمانی کی وجہ سے یہ آہستہ آہستہ دوسری قوموں میں منتقل ہو جاتا ہے اسی اصول سے نبوت اور دنیاوی سیادت بنی اسرائیل سے بنو اسمٰعیل کی طرف منتقل ہوئی تھی۔

شعیب الرحمٰن:۔ آپ نے اسلام کے سیاسی نظریے کی وضاحت میں اطاعتِ الٰہی کا جو فکر پیش کیا ہے اس سلسلے میں آپ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں مذکور اطاعت کا کیا جواب دیں گے؟۔

حافظ صاحب:۔ اطاعتِ مطلق تو صرف اللہ کے لیے ہے لیکن اس اطاعت کے لیے ظاہری پیروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کرنی ضروری ہے۔ تاکہ اسلام صرف نظریہ نہ رہے بلکہ رسولؐ کے عملی نمونہ کی صورت میں ایک نظام بن کر ابھرے چونکہ یہ نظام رسول وحی کی راہنمائی میں قائم کرنا ہے اس لیے رسولؐ کی پیروی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت ہی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔ "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" اسی طرح ملت کی بقاء کے لیے نائب رسول "اولی الامر" کی اطاعت بھی ضروری ہے تاکہ ایک شخص ملت کا تحفظ حاصل کر کے اطاعتِ الٰہی کا فریضہ آزادی سے انجام دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خلیفہ کی بیعت اللہ ہی کی بیعت سمجھی جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ "ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم" جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں حقیقت میں وہ اللہ کی بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اسلام میں خلافت نبی کی جانشینی کا نام ہے اس لیے خلفاء کی بیعت بھی درحقیقت اللہ ہی سے بیعت ہوتی ہے۔ خلافتِ راشدہ میں اسی تصور کے تحت خلفاء "خلیفۃ رسول اللہ" کہلواتے تھے۔ جب حضرت عمر بن الخطابؓ خلیفہ بنے تو ان کے لیے خلیفۃ

خلیفۃ رسول اللہ" کا لفظ تجویز ہوا جو بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے چھوڑ کر انہیں "امیر المومنین" کہنے کا فیصلہ کیا گیا۔

شعیب الرحمٰن:۔ ایک ذہن یہ ہے کہ چونکہ خلافتِ راشدہ نبوت سے متصل تھی اس لیے اس کی تجدید نہیں کی جا سکتی۔ اب نیا ڈھانچہ اور نظام وضع کرنا پڑے گا۔

حافظ صاحب:۔ اگر یہی ذہن بنا لیا جائے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ عبادات کا جو نظام عرب کے مخصوص حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں چلتا رہا اس پر آج نظر ثانی ہونی چاہیے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑنے کا حکم ہمیں واضح طور پر دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" میری سنت اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کو لازم پکڑو۔ دراصل احوال و زمانہ کے بدلنے سے نظام کی بقاء کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ ہم مستشرقین کے پیدا کردہ شبہات سے مغالطوں کا شکار ہو کر اسلام کی تعمیرِ نو یا تشکیلِ جدید کی ضرورت محسوس کرنے لگ جاتے ہیں حالانکہ غور فرمایئے انسانیت کا نظام حالات و زمانہ کے بے انتہا اختلافات کے باوجود آج تک قائم ہے اور اس کے لیے بنیادی ہدایات بھی ابدی ہیں۔ واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے بلکہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا لیکن آپؐ نے ایک مکمل نظام پیش کیا ہے۔ اگر ہم اس نظام کو چھوڑ کر صرف اصل نظریے کی بقاء کا دعویٰ کریں تو نبوت کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ نبی کا کام امتیازی نظام پیش کرنا ہی ہے۔ ورنہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دین کو کامل کرنے کے متفقہ عقیدہ کا کوئی معنی نہیں رہتا۔ آپؐ کا خاصہ یہ ہے کہ جو نظریہ اور عقیدہ آدم علیہ السلام سے چلا آتا تھا اسے آپؐ نے مکمل نظام کی صورت دے دی اگرچہ نظام تو پہلے انبیاء نے بھی پیش کیے ہیں لیکن وہ دینِ اسلام کے کامل اور اکمل نظام نہیں تھے۔ اسی لیے ہم ان کی شریعتوں کو ناقص کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو تبدیل کرنا کسی کا اختیار نہیں کیونکہ یہ ہر لحاظ سے کامل اور اکمل ہے کہ اب تا قیامت اس شریعت کو تبدیل کرنا کسی کا اختیار نہیں اس میں نہ کوئی تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ اس پر اضافہ کیا جا سکتا ہے خاتم النبیین کا یہی معنی ہے۔ در اصل جزئیات شریعت کی تبدیلی اور نظامِ جدید کی تشکیل کا دعویٰ نعوذ باللہ دینِ محمدی کے دیوالیہ پن کا اعتراف ہے۔ ہمارے ہاں کی مرعوبانہ ذہنیت بعض اوقات دورِ نبوت میں بھی جدید غیر اسلامی نظریات کی تلاش کی دعوت

دیتی ہے۔ حالانکہ اسلام اپنی تعبیر میں غیروں کا محتاج نہیں۔

اسلام کی صحیح تعبیر وہی ہے جسے ہمارے اولین اسلاف پیش کرتے رہے اور نظام کی صورت میں انھوں نے اسے اپنایا بھی۔ اسلام کا مثالی نظام وہی ہے جو خلفائے راشدین کے دور میں اُمت نے اختیار کیا اگر اسی ملتِ اسلامیہ کی تشکیل مقصود ہے جسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تو پھر اس کی شکل خلفائے راشدین کے نظام کی سی ہوگی۔ واضح رہے کہ ملت کا تعلق نبی سے ہوتا ہے ملت کے معنی عربی زبان میں ثبت شدہ یا لکھی ہوئی چیز کے ہیں چونکہ کسی فنکر کے عمل خطوط اسوۂ حسنہ کی صورت میں نبی ثبت کرتا ہے ان نقوش کا نام ملت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کی اضافت اللہ کی طرف بھی جائز نہیں حالانکہ ملت دین کا نقشہ ہے اور دین صرف اللہ کا ہوتا ہے۔

دراصل دورِ حاضر میں تصورِ ملت وہ حدِ اوسط ہے جو دو انتہائی نکات کو ایک جگہ جمع کر دیتی ہے۔ ایک یہ کہ خلفاء راشدین کا نظام حالات و زمانہ کی تبدیلی کے باوجود واپس کیسے لایا جاسکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ اسلام ایک ابدی نظام ہے اس لیے تاقیامت اس میں تبدیلی یا اضافے کی گنجائش نہیں مقصود یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے وجود کی صورت میں نظامِ محمدی اور خلفائے راشدین کی پیروی ممکن ہے اور اگر اسلام کے نام پر کسی نئے ڈھانچے اور نظام کو ترویج دینے کی کوشش کی گئی تو وہ اسلام نہ ہوگا۔ کیونکہ ملتِ محمدیہ کا وجود زندگی کے تمام شعبوں میں نظامِ محمدی بمعہ جملہ تفصیلات کی بقا اور ابدیت کا ضامن ہے۔ آج کل بعض لوگ خلفاء راشدین کے نظام حکومت میں جمہوریت کی تلاش شروع کر دیتے ہیں جبکہ اس سے قبل آمریت کو بھی اسلامی روح کے زیادہ قریب بتایا گیا ہے۔ اسی نظر سے صدارتی نظامِ حکومت کو پارلیمانی نظام کی جگہ اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے حالانکہ یہ سب نظام روحِ ملت کے منافی ہیں۔ خلفائے راشدین کا نظام اپنی امتیازی بنیادوں پر قائم ہوا اور اسی روح کے ساتھ چلتا رہا۔ ہمیں صرف اس کی مرکزیت سے کبھی آمریت کا واہمہ ہوتا ہے اور کبھی خلفائے راشدین پر عام لوگوں کی تنقید اور ان کے مساوی طور پر قانون کے سامنے جواب دہ ہونے کی بنا پر جمہوریت کی مزعومہ آزادی کا شبہ پڑتا ہے حالانکہ یہ اسی طرح مغالطہ ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا

انسان کی بعض صفات سے تشابہ ہوا تو قرآن مجید نے "لیس کمثلہٖ شئی" یعنی اس کی مثل کوئی نہیں کہہ کر اس مغالطے کا ازالہ کیا۔ ہمارے ہاں مقبول عام الفاظ استحکام، مساوات اور اور آزادی کا آمریت، اشتراکیت اور جمہوریت میں ثبوت اسی طرح ہے جیسے مشرکین نے اپنے بتوں کے نام خدائی صفات کے حامل رکھ دیئے تھے۔ قرآن کریم نے ان صفات کو صرف نام قرار دیا۔

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم واباءکم ما انزل اللہ بھا من سلطان۔ ان الحکم الا للہ (ترجمہ) یہ صرف نام ہیں جو تم اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ دیئے ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔

شعیب الرحمٰن:۔ نظریاتی طور پر ایک مسلمان نظام محمدی یا خلافتِ راشدہ کی ابدیت تسلیم کرتا ہے لیکن الجھن یہ ہے کہ احوال و زمانہ کے اتنے بُعد اور تفاوت سے اس دَور کو بُہو واپس لانا بڑا مشکل ہے۔

ایک جامد شے ہر دم بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ کیسے دے سکتی ہے؟

حافظ صاحب:۔ ہر نظام میں خیر و شر کے پیمانوں کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے جس پر اس نظام کے عدل و ظلم اور صلاح و فساد کا دارومدار ہوتا ہے۔ جس نظام کی جزئیات اور تفصیلات کی ترتیب اس انداز کی ہو کہ ہر جگہ خیر، عدل اور اصلاح غالب رہے تو وہ نظام فلاحی ہوگا۔

درحقیقت اسلام کا تصور فلاح ہے جو نجات سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ نجات میں کسی نہ کسی طرح ایک نقصان دہ چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے خواہ دوسرے پہلو سے کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے جیسے کوئی شخص چھت سے کود کر جانی دشمن سے نجات حاصل کرے خواہ اسے زخمی ہو کر حاصل ہو لیکن فلاح عربی زبان میں اس کامیابی کو کہتے ہیں جو ایک منظم محنت کے بعد مقصود سے بارآوری کی صورت میں حاصل ہو۔

عربی زبان میں کاشت کار کو بھی فلاح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باقاعدہ محنت سے کھیتی باڑی کر کے ثمرہ حاصل کرتا ہے دراصل نظام خیر، عدل اور اصلاح کی اسی ترتیب کا نام ہے اس ترتیب کو باقی رکھتے ہوئے جو تدبیریں اور مساعی کی جاتی ہیں وہ نظام کا لازمی حصہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ اس نظام کی لچک کی بنا پر اس کی ابدیت کی دلیل ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر کتاب و سنت میں تجارت اور صلح و جنگ کے لیے ہدایات موجود ہیں لیکن ان

ہدایات کے علاوہ ہم تجارت کے لیے یا صلح و جنگ کے میدانوں میں جو وسیع تدبیریں کرتے ہیں۔ وہ اس زمرے میں آتی ہیں۔ یہی ذہنی کوشش اجتہاد اور عملی کوشش جہاد کہلاتی ہے۔ اقتصاد و سیاست کے شعبوں میں حکومت کے انتظام کا بہت بڑا حصہ انہی کوششوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان مساعی میں عموماً خیر و شر یا عدل و ظلم کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا اس لیے ایسے معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضؓ کی سوچ پر کبھی قدغن نہیں لگائی اور یہی میدان مشورے کا ہے۔ جنگِ بدر میں قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا، کھجوروں کو پیوند کرنے سے منع کرنا، بریرہ کو مغیث کے نکاح میں رہنے کا مشورہ دینا اس قبیل سے ہے البتہ ان تدبیروں میں اگر کہیں خیر و شر کا مسئلہ پیش آجائے تو یہ بھی شرعی ہدایات کی پابند ہو جاتی ہیں جیسا کہ جنگِ بدر کے قیدیوں کو چھوڑنے پر اس لیے سرزنش کی گئی کہ ان کے فدیہ کے پسِ منظر میں متاعِ دنیا کا لحاظ غالب ہو گیا تھا دراصل کسی حکمران کا نظم حکومت چلانے میں اختیارات شرعی حدود سے محدود ہے۔ چونکہ آج نظام کا لفظ انتظامِ حکومت کے مفہوم سے بہت وسیع تر ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظمِ حکومت میں اجتہاد کرنا، دوسروں سے مشورہ کرنا اور اس سلسلے میں دوسروں کو تدبیر کی پوری آزادی دینے سے یہ مغالطہ پڑتا ہے کہ شائد اس بارے میں کھلی چھٹی دے دی گئی ہے حالانکہ مشورہ اسلامی اصولوں اور ضوابط کا پابند ہے اس میں اسلامی رُوح کا جاری اور ساری رہنا ضروری ہے اور یہ صرف جائز اُمور میں ہوتا ہے۔

اجتہاد کا مفہوم اگرچہ ہر قسم کے حالات میں شرعی تعلیمات کا اطلاق ہی ہے لیکن اجتہاد کی اجازت شرع کو حرکی اور مستقل حیثیت دیتی ہے اگرچہ اجتہاد کے لیے شرعی حدود متعین ہیں اور اس کے طور طریقے بھی شرع نے مقرر کیے ہیں۔

جب ہم نظامِ مہدی یا خلافتِ راشدہ کے نفاذ کی باتیں کرتے ہیں تو سارا مقصود نظام کے ان لازمی پہلوؤں کی بقا ہوتا ہے جو ہم نے بیان کیے ہیں۔ تدبیر و اجتہاد کے جمود کا خلافت راشدہ کے مدعیوں پر غلط الزام لگایا جاتا ہے۔

مسلمان خلفاء کی تدبیریں ہمارے لیے ایک تاریخی تجربے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ تجربات فائدہ اٹھانے کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ دورِ ماضی کو واپس لانے کے لیے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے خلفاء راشدین کے انتخاب کی مثال پیش کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ خلافت نبوت کی جانشینی کا نام ہے لہذا خلیفہ کے لیے زیادہ سے زیادہ نبی کی صفات کے قریب تر ہونا ضروری ہے۔ خلافتِ راشدہ کے مثالی دور کے انتخابات کو سامنے رکھیں تو ہر انتخاب میں اسلامی نظام کی اس ہدایت کا لحاظ سامنے آتا ہے لیکن تقرر خلیفہ کا کوئی طریقہ متعین نہیں کیونکہ وہ تدبیر ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے اس قدر پابند تھے کہ پہلے قرآن مجید کو بھی کتابی صورت دینے کے لیے تیار نہ تھے وہی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کرتے ہیں تو اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نامزد نہ کیا تھا یہی حال خود حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ہے۔

آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اتباع میں چھ اشخاص کو نامزد تو کیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں کسی کی تعیین نہیں کی گویا جزوی اتباع کے باوجود نیا طریقہ اپنایا حضرت ابوبکر رضؓ سے لے کر حضرت علی رضؓ کے انتخاب تک جتنے نام خلافت کے لیے پیش ہوئے ان کا سب سے اہم معیار یہی تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر تھے یہ قرب رشتہ داروں کے اعتبار سے تو اتفاقی تھا اصل قرب تقوی اور سبقت اسلام کا تھا یہی وجہ ہے کہ خلیفے کے تقرر یا تجویز کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ہجرت وغیرہ کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی کیونکہ یہ متقی اور مسلم معاشرے کے مسائل سے باخبر ہونے کی نشانی تھی

حاصل یہ ہے کہ اس انتخاب میں نیابت نبوت کے اصول کا پورا لحاظ رکھا گیا لیکن تدبیری مراحل میں اجتہاد کی پوری آزادی دی گئی۔ اسلامی نظام کی بقاء اور ابدیت کے لیے یہ دونوں پہلو خلافت راشدہ کے اعلیٰ دور کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں!

شعیب الرحمٰن :۔ اجتہاد کا میدان تو بڑا وسیع ہے یقیناً آپ کے ذہن میں اس کے تفصیلی گوشے ہوں گے بہت سے عقدے اس وقت ہی کھلیں گے۔ .....

.... جب اس نظام کو ہم اپنائیں گے لیکن آپ یہ بتائیے کہ کسی حکومت کو اسلامی بنانے کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے؟

حافظ صاحب :۔ آپ کا سوال بڑا اہم ہے حکومت کی حیثیت ایک فرد یا ادارے کی ہوتی ہے۔ کوئی کافر شخص اپنی زندگی کے وسیع روابط اور الجھنوں میں گھرا ہوا اور مسلمان ہونا چاہیے تو اس کا طریق تو یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جائے جو اس کے

اسلامی دور میں داخلے کے معاہدے کا اعلان ہے لیکن کسی ادارے کا اعلان وہ دستور و منشور ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ ادارہ معرض وجود میں آتا ہے اور اسی کے تحت وہ ادارہ اپنے مقاصد کے لیے رواں دواں ہوتا ہے گویا حکومت و ریاست کے لیے مسلمان ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ اس کا آئین و دستور کتاب و سُنّت ہو اور جملہ قواعد و ضوابط اسی بنیادی دستور قرآن و سُنت کے تابع ہوں جب تک کوئی حکومت کتاب و سُنّت کے دستور کا اعلان نہیں کرتی وہ اسلامی حکومت نہیں ہوتی۔ اگرچہ سارے نظام کو عملی طور پر کتاب و سُنت کے مطابق بنانے کا مرحلہ آہستہ آہستہ طے ہوگا۔ لیکن اس اعلان اور حلف کی حیثیت وہی ہے جو ایک شخص کے کلمہ پڑھ کر مسلمان بننے کی ہے اگرچہ کسی علاقے میں نفاذِ شریعت یکطرفہ عمل نہیں۔ بلکہ اس کی کامیابی کے لیے حکومت و عوام دونوں کی کوششیں ضروری ہیں لیکن کسی ملک میں کتاب و سُنّت کی دستوری حیثیت حکومت کے سرکاری اعلان ہی سے ممکن ہے۔ عوام اپنے طور پر کتنی بھی شریعت کی پیروی کریں سرکاری اعلان کے بغیر حکومت اسلامی نہیں بن سکتی بلکہ ایک سمت متعین کرنے کے لیے شریعت کا وضعی قانون سے تضاد دور کرنا پہلی ضرورت ہے اراکینِ حکومت، سرکاری مشینری اور عوام مسلمان ہونے کے ناطے ایک طرف محمدی شریعت کے مکلف ہوتے ہیں تو دوسری طرف آئین و قوانین سے وفاداری کا عہد کر کے تضاد کا شکار رہتے ہیں۔ کیونکہ آئین سب سے بالاتر دستاویز ہوتی ہے اس کی بالادستی کی صورت میں کتاب و سُنّت کی بالادستی قائم نہیں رکھی جا سکتی لہٰذا میرے نزدیک حکومت کو اسلامی نظام کی ابتدا کتاب و سُنّت کے آئینی اعلان سے کرنی چاہیے۔

شعیب الرحمٰن: ۔ کیا کتاب و سُنّت کی آئینی حیثیت کے بعد کوئی آئینی نظام قائم رہ سکے گا؟ اس طرح ایک وسیع خلا پیدا ہو جانے کا امکان ہے!

حافظ صاحب: ۔ ایک نظام کی جگہ دوسرے نظام کے لانے میں ایسی مشکلات پیش آتی ہیں لیکن کتاب و سُنّت ایک الہامی ہدایت ہے اس لیے اس مسئلہ کا حل بھی اسی سے ملے گا۔

میں نے آپ سے ذکر کیا ہے کہ انتظامِ حکومت کا تعلق تدبیر و اجتہاد سے ہے اس لیے تدبیر و اجتہاد پر مبنی حکومت کا ڈھانچہ اور سرکاری مشینری باقی رہے گی۔ صرف آئین کی ان شقوں اور سرکاری اداروں کی ان کارگذاریوں پر اثر پڑے گا جو کتاب و سُنّت کے منافی ہیں اور یہ کام جو عملی اصلاح کا ہے تدریج سے ہوگا۔ ہمارے مروّجہ نظام میں بھی حکومتوں میں انقلابات اور آئے دن مارشل لاء لگتے رہتے ہیں جن میں آئین عموماً منسوخ یا معطل کر دیا جاتا ہے، سرکاری مشینری میں بے انتہا ردوبدل کیا جاتا ہے، مارشل لاء

کے حکم اور ضابطے اختیارات کا تعین کرتے ہیں، فردِ واحد یا مضبوط گروپ اپنی مرضی کو قانون کا درجہ دیتا ہے زیادہ سخت رویہ اختیار کیا جائے تو بڑی بڑی عدالتوں سے بھی اختیارِ سماعت چھین لیا جاتا ہے گویا پوری حکومت وقتاً فوقتاً جاری کردہ احکامات کے تابع ہوتی ہے عدل وظلم اور خیر وشر کا پیمانہ ایڈمنسٹریٹر کی زبان بن جاتی ہے۔ جبوری حالات میں ملک کے سارے کام آخر چلتے ہیں، کتاب وسنت کی آئینی بالادستی سے کوئی نظام تل پٹ نہیں ہو جائے گا بلکہ اگر کسی کو تبدیلیوں کا وسیع اختیار دیا جائے گا تو عدل وانصاف کے ابدی ضابطے کتاب وسنت کی شکل میں ٹھوس حقوق کے محافظ ہوں گے پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوگی۔ انسان جو تدبیریں کرتا ہے ان کا انجام تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کیا خدا کی حاکمیت عملی طور پر قائم کرنے سے رحمتِ الٰہی ہمیں اپنی آغوش میں نہیں لے گی؟ کتاب وسنت کی موجودگی میں ملکی آئین اور اداروں کی کارکردگی پر جو نظرِ ثانی کی جائے گی اوّل تو اس سمت چلنے سے نئی راہیں خود کھلیں گی۔ لیکن اگر فرض کریں کہ کہیں رکاوٹیں پڑ جاتی ہیں تو ہنگامی طور پر بعض جگہ STATUS QUO بھی رکھا جا سکتا ہے۔ قحط سالی کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے چوری کی سزا معطل کر دی تھی۔ اسی طرح آپؓ نے اور دیگر خلفاء نے اصلاحی مقاصد سے اضافی سزائیں دیں اور پابندیاں بھی لگائیں۔ بعض لوگ انہیں شریعت میں اضافہ یا تبدیلی کرنے کی دلیل بناتے ہیں لیکن یہ شرعی ہدایات کی روشنی میں انتظامی اور تعزیری اقدامات تھے جن کا شرع نے حاکم کو اختیار دیا ہے مقصود یہ ہے کہ جملہ اقدامات کتاب وسنت کی روشنی میں ہونے چاہئیں۔

شعیب الرحمٰن: ۔ نفاذِ شریعت کے سلسلے میں سماجی اور عوامی سطح پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حافظ صاحب: ۔ شریعت کی عملداری دو طرفہ عمل ہے اس سلسلے میں حکومتی کوششوں کو بارآور بنانے کے لیے سماجی خدمت گذاروں اور عوام کا بڑا دخل ہے۔ معاشرہ اگر اسلام کے لیے تیار نہ ہو تو اسلامی پابندیوں کے خلاف ذہنی بغاوت بھی پیدا ہو سکتی ہے اس سلسلے میں اگر سیاستدانوں کی طرز پر عوام کی خوبیوں کی گردان کی جائے تو ساری ذمہ داری حکومت پر آن پڑتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک نفاذِ شریعت سب کی ذمہ داری ہے۔ اسلام کو قبول کرنے کی مخاطب جس طرح حکومت ہے اسی طرح عوام ہیں بلکہ عوام کی قوت سے حکومت کو قوت ملتی ہے اور عوامی دباؤ سے حکومت مجبور ہو جایا کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:۔ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ تم سب ذمہ دار ہو۔ اور سب سے ان کی ذمہ داری کا حساب ہوگا حقیقت یہ ہے کہ جہاں حکومت اپنے ذرائع ابلاغ سے عوامی ذہن کو اسلامی اقدار سے روشناس کراتی ہے اور مختلف پابندیوں سے فحاشی اور برائی کی انگیخت کرنے والی راہوں کو بند کرتی ہے وہاں ان چیزوں کا

خندہ پیشانی سے استقبال کرنا اور خدائی احکامات کی تعمیل کرنا عوام کی ذمہ داری ہے۔

علماء اور سماجی کارکن اس سلسلے میں فضا کو ہموار کرنے اور خیر کو فروغ دینے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

شعیب الرحمٰن: - نفاذ شریعت کے سلسلے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟

حافظ صاحب: - آپ سے ابھی تک زیادہ گفتگو نظامِ حکومت اور نفاذِ شریعت کے سلسلے میں ہوتی رہی ہے لیکن اس کے لیے کارکن اور مشینری مہیا کرنے کے لیے افراد کی تیاری کلیدی کام ہے۔ چونکہ میں علمی مزاج رکھتا ہوں اس لیے میری زیادہ کوشش بحث و تحقیق اور تعلیم و تدریس کے میدانوں میں صرف ہو رہی ہے میرے زیرِ اہتمام جو ادارے چل رہے ہیں وہ مجلس التحقیق الاسلامی کے تحت مربوط ہیں اس مجلس کا آرگن ماہنامہ محدث ہے مجلس کے اہم ترین مقاصد نفاذِ شریعت کی مساعی کو بارآور بنانا، اس سلسلے میں علمی مدد دینا اور کارکنوں کی تیاری ہیں۔

مذکورہ مقاصد کے لیے مجلس کا ایک شعبہ ادارہ البحوث العلمیہ (المجمع اسلامی (ISLAMIC ACADEMY) ہے جس میں اہلِ علم کی وساطت سے ملک و ملت کو درپیش مسائل میں کتاب و سنت کی صحیح راہنمائی پیش کی جاتی ہے۔ نیز دیگر زبانوں سے اردو اور عربی میں ترجمے کے کام کا اہتمام ہے۔ کیونکہ اس وقت جو حالات ہمارے سامنے ہیں ماضی میں جزوی طور پر کئی ملکوں کو ان کا سامنا ہوا۔

بلادِ عرب بے مصر بالخصوص ایسے مسائل سے دوچار ہوا اس لیے عرب علماء نے اس سمت معتد بہ لٹریچر بھی پیش کیا ہے لیکن ہمارے ہاں یا تو ان مسائل کی طرف توجہ کم دی گئی یا اس میدان کا شہسوار طبقہ عربی سے نابلد ہونے کی وجہ سے اس لٹریچر سے استفادہ نہیں کر سکا۔

قدیم اور جدید قانون و شریعت کے ماہرین علماء کی ایک مجلس نے ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک چھ سال کی مدت میں اسلامی دستور کا ایک خاکہ بھی تیار کیا تھا جو بعض ناگوار وجوہ کی بنا پر نافذ نہ ہو سکا۔ اسی طرح ۱۹۷۸ء میں بھی شیخ الازہر کی سرپرستی میں ایک اسلامی دستور کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ جو عربی میں چھپ کر اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کمیٹی کے ایک فاضل رکن ڈاکٹر مصطفیٰ کمال وصفی نے اسلامی نظامِ حکومت کے مختلف شعبوں کے موضوع پر ایک محققانہ تصنیف بھی کی ہے۔ جس کا نام (مصنفۃ النظم الاسلامیہ) ہے۔

اسلامی حکومتوں کے زوال کے دور میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی کتابیں بھی بڑی اہم ہیں ہمارے ہاں سے محاسبے کے موضوع پر ابن تیمیہؒ کی کتاب "الحسبۃ" اور اسلامی نظام عدالت کے بعض اہم پہلوؤں پر مشتمل ابن قیمؒ کی تصنیف "الطرق الحکمیۃ" کا ترجمہ ہو چکا ہے بہت سا دیگر کام تکمیل کے مراحل میں ہے۔ نفاذِ شریعت کی کوششوں کی ایک کڑی لاہور میں "کلیۃ الشریعۃ" کا افتتاح بھی ہے۔

اگرچہ کلیۃ الشریعۃ میں علماء کی بڑی معقول تعداد تین کلاسوں کی صورت میں زیرِ تربیت ہے جن میں سے ہماری ایک کلاس اسی قسم کی ہے جس میں وہ علماء زیرِ تربیت ہیں جو جدید علوم سے بھی بہرہ ور ہیں ان میں عصری یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی شامل ہیں ہماری کوشش ہے کہ یہ شعبہ مستقبل میں "المعہد العالی للشریعۃ" یعنی اسلامی شریعت کی اعلیٰ تربیت گاہ کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دے۔

اس کے علاوہ "مدرسہ رحمانیہ" جو ملک کی ایک معروف دینی درس گاہ ہے اس کا ذکر اس مناسبت سے کر رہا ہوں کہ غالباً آپ کو اس انٹرویو کی تحریک بھی اسی دعوت نامہ سے ہوئی جو اس درسگاہ کی تقریب اسناد پر آپ کو بھیجا گیا تھا۔ مدرسہ رحمانیہ دینی مدارس کو جدید انداز پر چلانے کے لیے ایک تحریک ہے۔ اس نے دینی مدارس کو منظم طریقہ پر چلانے کے لیے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ اگرچہ ہماری مذکورہ کوششیں مناسب عمارات کی نایابی کی وجہ سے متفرق عمارتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تاہم ہمارے سامنے لاہور میں ایک اسلامی یونیورسٹی کا صحیح معنوں میں قیام ہے!۔

سعودی یونیورسٹیوں کے پاکستانی طلباء کا نمائندہ اجتماع

سعودی عرب کی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم جملہ اہلِ حدیث طلباء کا سالانہ اجتماع مؤرخہ ۲۲، ۲۳ اگست ۱۹۶۱ء بروز ہفتہ۔ اتوار بمقام مرکزی دفتر جمعیت اہلحدیث ۱۰۶۔ راوی روڈ لاہور ہو رہا ہے جس میں پاکستانی مدارس کا سعودی جامعات سے رابطہ اور وہاں زیرِ تعلیم طلبہ کے مسائل پر غور و فکر ہوگا۔ نیز بیرون پاکستان تحریک اہلحدیث کو فروغ دینے کے لیے لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

دینی مدارس کے نمائندے مع جملہ کوائف ادارہ متعلقہ اجلاس ہذا میں شرکت فرمائیں تاکہ ان کے معادلہ اور فراہمی کتب وغیرہ امور میں پیش رفت ہو سکے۔

محمد شریف عتیق ۔ جامعہ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ۔ ریاض (سعودی عرب)